© rasailojaraid.com

کتابیں لکھیں اور "لال منی سیف الملوک"، "گل بکاؤلی" اور "شاہ جلال مادھومالا" کی تصنیف سے قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اور رومانی ادب کو بڑی تقویت ہوئی۔ قریشی مگن ٹھاکر کی "چندراوتی" اور علاول کی "پدماوتی" نے ادب پر جو مستقل اثر ڈالا اس کا اندازہ موجودہ دور کے لکھنے والوں کی تصانیف سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

جنگِ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست سے مسلمانوں کی شاندار ادبی تصانیف کا یہ دور ختم ہو گیا اور اس کے بعد منزل سے دور ہو جانے کا ایک گہرا احساس طاری ہونے لگا۔ ۱۱۷۶ سن بنگالی (مطابق ۱۷۷۰ء) کے عظیم قومی حادثے نے لوگوں کی ہمت بالکل توڑ ڈالی۔ بھوک اور وباؤں سے وہ بڑی تعداد میں ہلاک ہو گئے اور کمپنی کے بے رحم ملازموں کے ظلم و ستم نے امید کی موہوم کرن تک باقی نہ چھوڑی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جس کا مقصد ایک خاص ضرورت کی تکمیل تھا۔ بنگالی مسلمانوں کا فوج میں داخلہ بند کر دیا گیا اور عدالتی اور انتظامی محکموں کے دروازے بھی ان پر بند ہو گئے۔ تمام عہدے اور مراعات ہر چیز انگریزوں اور ان کے ہم کار ہندوؤں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس دور کے ادب کا اہم واقعہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ نثر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ میر مشرف حسین (۱۸۴۸ تا ۱۹۱۱ء) پہلا اہم مسلمان مصنف ہے جس کی "رتنا وتی" اور "بشد سندھو (حادثۂ کربلا)" نے لوگوں کو کافی متاثر کیا۔ اسی زمانے میں کیقباد و شہادت حسین اور عبدالکریم شاہتیا وشارد بھی لکھنے لگے۔ آج کل جو بڑے اساتذہ موجود ہیں ان میں ڈاکٹر محمد شہید اللہ اور جسیم الدین کی تصانیف بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ نے علمی تحقیقات کو اپنا موضوع بنایا اور جسیم الدین نے عوامی ادب کے چھپے ہوئے جواہر پارے پیش کیے۔ قاضی نذر الاسلام نے انقلابِ فکر میں ایک نئے باب کا آغاز کیا اور اپنے ادبی شہ پاروں کے ذریعہ مسلمانوں کے ایک انداز فکر کو واضح کر دیا۔

بنگلہ ادب کے گذشتہ بیس سال پر نظر ڈالیں تو یہ امید افزا معلوم ہوگا۔ جھیل میں رکے ہوئے پانی کو بہنے کا راستہ مل گیا ہے اور اب یہ دریا کی روانی سے قریب ہے۔ ذیل میں دیے ہوئے سرسری اعداد و شمار سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ناول ۲۵۰۔ افسانہ ۱۵۰۔ ڈرامہ ۱۲۰۔ بچوں کی کتابیں ۱۰۰۔ تحقیقی تصانیف ۱۵۰۔ مذہبی کتابیں ۱۰۰۔ سفر کی کہانیاں ۵۰۔ یہ اعداد مکمل نہیں ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ کئی تصانیف اس میں شمار نہ کی گئی ہوں۔ اس محتاط اندازے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کتنی سنجیدگی اور توجہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں۔

سید ولی اللہ ایک فکر انگیز ناول نویس اور ڈرامہ نگار ہے۔ اس کے ناول "لال شالو" کا ترجمہ کوئی تین سال پہلے فرانسیسی میں کیا گیا تھا اور فرانسیسی اکیڈمی کے رکن مارشل برائن نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ دو سال پہلے اس کی کتاب "چندرا ما باشیا" (چاند گرہن) شائع ہوئی تھی۔ اس میں ولی اللہ نے دور جدید کے انسان کی برگشتگی کے مسئلے پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مسئلہ صرف مغربی دنیا کے معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے اور در حقیقت ہمارے اپنے حالات و مسائل بھی ہیں جن پر گہری توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دور جدید کا ایک انسان کچھ ایسی بے گانگی محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں رہتا ہے۔ اسکول کے ایک مدرس کے سامنے قتل کی واردات ہوتی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ مجرم کون ہے لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کا نام لے سکے۔ اس کی بے بسی، اس کی الجھن، اس کی کمزور قوت فیصلہ اسے ایک آہنی جال میں جکڑ دیتے ہیں جس سے نکلنا اس کے لیے تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عمودی سرنگ میں داخل ہو کے فضائی دباؤ کی پیمائش کرنے کی مہم کے مانند ہے۔ یہ شخص بزدل ہے اور یہیں سے ذاتی محاسبہ کرنے کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ ولی اللہ کا ڈرامہ "باہی پیر" ایک زوردار تمثیل ہے جس سے موجودہ دور کی ڈرامہ نگاری میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

ابو رشد شہر کا باشندہ ہے اور اپنے موضوع پر مخصوص اور بے لاگ انداز میں لکھتا ہے۔ اس کا تازہ ناول "ڈوبا ہولوڈی لگی" (جوہڑیا تالاب) میں ایک انسان کی تنہائی اور ماحول کے اثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ مریض کے زخموں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اس کو شہر کا مسخ شدہ چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابو الکلام شمس الدین کو دیہات کے قصے کہانیوں میں سکون ملتا ہے اس کی کتاب "کاشبونر کنیا" (جنگل کی بیٹی)، عام مردوں اور عورتوں کی کہانی ہے جو مصائب سے بھری دنیا میں سکون اور امن کی تلاش میں مصروف ہیں۔ علاء الدین الآزاد نے چاٹگانگ کے پہاڑی علاقے کے فطری مناظر میں گوشۂ عافیت تلاش کیا ہے لیکن وہ حقیقت پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مزید تجربے حاصل کرنے کے لیے اب اس گوشے سے نکل رہا ہے۔ ہم عصر لکھنے والوں میں دو اہم رجحان نمایاں نظر آتے ہیں۔ خارجیت اور رومانیت۔ تیسرا عنصر تاریخی ہے جو روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ ابو جعفر شمس الدین کی "بھاول گرراپاکھن" (بھاول گڈھ کی داستان) میں وہابی تحریک کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں اور سروار جو شن الدین (زین الدین) کی "نیل رونگ رکھتا" (نیلا خون) میں نیل کی کاشت کرنے والے کسانوں کی جدوجہد بیان کی گئی ہے۔ کافی عرصہ پہلے ایک ڈرامہ ممنوع قرار دیا گیا تھا جس میں نیل کے کاشتکاروں کے مصائب اور برطانوی تاجروں کے ظلم کا تذکرہ تھا۔ آزادی کے بعد غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔

شہید اللہ قیصر نے حالات کے تاریخی ارتقا میں معاشرے کے حصے کی ایک نئے انداز میں تاویل کی ہے۔ اس کے ناول "سنگ سپ ٹک" میں دوسری عالمی جنگ کے دوران پیش آنے والے مصائب کا تذکرہ ہے۔ (۱۹۴۳ میں بنگال میں زبردست قحط پڑا تھا)۔ اس کے علاوہ اس ناول میں آزادی کی جدوجہد اور حصول مقصد میں کامیابی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ظہیر ریحان ایک اور اچھا لکھنے والا ہے۔ اس کی تصنیف "ہزار بچھر دھورے" (ہزار سال سے) تاریخ کا ایک دل کش مطالعہ ہے۔ فی الحال وہ عوامی کہانیوں اور پرانی داستانوں پر مبنی فلمیں بنانے میں مصروف ہے۔ ظہور الحق کی "شات شتر" پر یونیسکو کا انعام دیا گیا ہے۔ یہ بہت عمدہ روداد سفر ہے جس میں جا بجا موجودہ سوسائٹی کے بارے میں ذاتی تاثرات ظاہر کیے گئے ہیں۔

نذر الاسلام کی اتباع کرنے والے کئی شاعر موجود ہیں جو نہ صرف ظالم اور مظلوم کی کشمکش بیان کرتے ہیں بلکہ زندگی کا ایک بالکل ذاتی نظریہ بھی رکھتے ہیں اور ان کی برہمی اور رومانیت نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ فرخ احمد روایت پسند ہے اور اس کی تصنیف "شات شاگورا ماجھی" (سات سمندر کا ملاح) سندباد کے ایک فرضی سفر کی کہانی ہے جس میں سیاح انوکھی چیزیں اور غربت و غلاظت کے مناظر دیکھ کر خوف زدہ نظر آتا ہے۔ سید علی احسن ایک ذہین شاعر ہے اور اس کی ماضی پرستی انتہائی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ تنویر الحق مرصع الفاظ کا خزانہ بکھیر کر بہت دل کش تصویر کشی کرتا ہے۔ احسن حبیب اپنی افسردہ مسکراہٹ سے ماحول کا نقشہ بدل دیتا ہے اور زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھتا ہے۔ سکندر ابو جعفر اپنے دبے ہوئے غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔

حال ہی میں نوجوان شاعروں کی ایک خاصی تعداد نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ سب سے پہلے ہم شمس الرحمٰن کا ذکر کریں گے جو شہر کے پر اسنے حصے میں پروان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چڑھا اور اپنے ماحول کے فوری رد عمل کو خوب سمجھتا ہے۔ غالباً اس گروہ میں وہ سب سے زیادہ زورِ بیان کا مالک ہے۔ اس کے چونکا دینے والے الفاظ، چست بندش اور واضح استعارے اس کے موضوع کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کی گہرائی تک پہنچتا اور اپنی حریتِ فکر کو برقرار رکھتا ہے۔ حسن حفیظ الرحمٰن نے شاعری کے خزانے میں چند جواہر پاروں کا اضافہ کیا ہے۔ محفوظ اللہ، عبدالستار، عبدالرشید خان، عمر علی، المحمود اور شاہد قادری دنیا کا ایک دوسرے ہی زاویہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ڈرامے کے میدان میں نذیر احمد نے آزادی کے فوراً بعد ہی کچھ قابل قدر ڈرامے پیش کیے جو زیادہ تر ریڈیو کے لیے لکھے گئے تھے۔ بلاشبہ وہ بنگالی اسٹیج کا سب سے بڑا معمار ہے۔ کچھ عرصے بعد نورالمومن نے "روپ انتر" اور "نیمے سس" (پاداش عمل) پیش کیے جن کا کافی اچھا اثر ہوا۔ منیر چودھری نے اپنے لیے ایک نیا موضوع تلاش کیا ہے اور وہ تاریخ اسلام کے زریں واقعات بیان کرتا ہے جس کی ایک مثال "روکت ماکتو پرانتور (خون پیا ہوا کھیت) ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ موجودہ معاشرے کے مسائل پر قلم اٹھائے تو زیادہ کامیاب ہو گا۔ اسکندر ابن مشیخ دیہی معاشرے میں موجود متضاد قوتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس نے سب ڈرامہ نگاروں سے زیادہ ڈرامے شائع کیے ہیں۔ سعید احمد ڈرامے کے میدان میں ابھی نووارد ہے لیکن اس نے "کلبیلا" (وہ شے) اور "سنگ میل" دو بہترین ڈرامے پیش کیے ہیں۔ "کلبیلا" کو بنگالی ڈرامہ نگاری میں ایک نیا موڑ قرار دیا گیا ہے۔

ایک مختصر مضمون میں اس موضوع پر سرسری طور پر ہی لکھا جا سکتا ہے۔ ایسے کئی لکھنے والے ہیں جن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جو اپنے کام میں تن دہی سے مصروف ہیں لیکن فی الوقت اس کی گنجائش نہیں۔ ہم عصر بنگلہ ادب میں روایت پسند، رومانیت پسند، وجودیت پسند اور دوسرے رجحانات کے نقیب موجود ہیں۔ یہ سب ایک مخصوص منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف سمتوں میں اپنی کشتیاں چلا رہے ہیں۔ یہ منزل مقصود ہمارے معاشرے کے بے شمار پہلوؤں اور ہمارے روحانی اضطراب کا تجزیہ ہے تاکہ ہم زندگی کے صحیح مفہوم سے پوری طرح آشنا ہو سکیں۔

(ترجمہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جناب سید عبدالصمد خاں

پشتو ادب

گزشتہ بیس سال کے دوران پشتو زبان و ادب کی رفتار ترقی کا مختصر جائزہ پیش کرنے سے قبل پشتو زبان اور پشتونوں کے تعارف کے ضمن میں یہ جاننا از بس ضروری ہے کہ پشتو جن لوگوں کی زبان ہے وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ پشتو کا اوّلین معلوم شاعر امیر کروڑ پہلوان جو دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل میں گزرا ہے جدی مسلمان تھا اس لیے پشتو زبان کی معلوم و مسلمہ تاریخ کا آغاز پشتونوں کی قبولیت اسلام کے بعد ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مختصر لفظوں میں پشتو صرف مسلمانوں کی زبان اور اس کا معلوم ادب کلیتہً مسلمانوں کا ادب ہے، اس میں کسی غیر اسلامی عنصر کا دخل نہیں ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پشتو ادب کی ایک اپنی انفرادیت بھی ہے لیکن یہ انفرادیت افغانیت کے صالح عناصر اور اسلام کے اثرات کے اجتماع و اشتراک کا نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے پشتو ادب کا زیادہ حصہ فعال، محرک و متحرک اور مثبت و بامقصد ہے۔

تعلیمات اسلام، عربی زبان کے الفاظ و تراکیب اور فارسی ادبیات نے پشتو ادب کی ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے یہاں تک کہ پشتو شاعری بحور و قوافی وغیرہ میں فارسی شاعری کی مقلد ہے لیکن اس نے اپنی منفرد خصوصیات بہر حال قائم رکھی ہیں اور اس کی یہی خصوصیات مسلمانوں کی ادبیات میں اضافہ کرتی ہیں۔ پشتو ادب کا بیشتر حصہ شعری رہا ہے۔ اس میں پہلے نثر کی بہت زیادہ کمی محسوس کی جاتی تھی لیکن وہ رفتہ رفتہ اس کمی کو پورا کرتا جا رہا ہے اور اب اس کا نثری حصہ کیفیت و کمیت دونوں اعتبارات سے تسلی بخش اور حوصلہ افزا ہے۔ پشتو زبان اور ادب کی ترقی کے لیے افغانستان میں بھی نمایاں کام ہو رہے ہیں لیکن اس مضمون میں صرف پاکستان کے پشتو ادب کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادب پر ملّی زندگی کے اثرات

پشتو ادب اور قومی و ملّی زندگی میں ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس کے جوہر اُس وقت زیادہ کھلتے ہیں جب یا تو آزاد فضا ہو یا ملت کو خطرات درپیش ہوں۔ پشتو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زیادہ عروج کا دور وہی تھا جب یا تو پشتونوں کی آزادی و خود مختاری کا زمانہ تھا یا وہ [illegible] مصروف پیکار و جہد تھے۔ محکومی اور غلامی کی فضا پشتو ادب کو زیادہ راس نہیں آتی۔ [illegible] خطرات سے پٹھانوں کی طرح آزادی پسند ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پشتو ادب کسی دور میں بالکل ختم رہا ہو۔ ہاں اس کی نشأۃ ثانیہ کے لیے یا تو جدوجہد اور کشمکش کا دور چاہیے اور یا آزادی و خود مختاری کا۔

تحریکِ آزادی کے بعد جس طرح اردو ادب کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور حالی و اقبال جیسے عہد آفرین شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے قوم کی مُردہ رگوں میں تازہ خونِ زندگی دوڑایا، بالکل اسی طرح پشتو شعرا نے بھی کروٹ لی اور خوشحال خان خٹک، رحمان بابا اور علامہ اقبال کا دامن تھام کر ایسے نغمے گائے کہ قوم کی مایوسیاں امیدوں میں بدلنے لگیں۔ بیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کا اپنے اندر احساس پیدا کرنے سے ہوا۔ آزادی کی متعدد تحریکیں میدانِ عمل میں آئیں جن سے پشتون بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے اُن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پشتو ادب کا محبوب و مطلوب دور عود کر آیا۔ چنانچہ جب ہم آزادی سے چالیس تیس سال قبل کے زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو قوم میں غلامی سے نفرت پیدا کرنے اور حصولِ آزادی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرنے میں متعدد شاعر جا بجا جوہر دکھاتے دیتے ہیں۔ اس دور کے جن شاعروں نے پشتونوں میں نئے انقلابی خیالات و جذبات پیدا کرنے کی مساعی کیں ان میں سے کچھ تو آزادی کا سورج طلوع ہونے سے قبل رحلت کر گئے، بعض آزادی کی سحر دیکھنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور کچھ ابھی بقیدِ حیات ہیں اور ادبی تخلیقات میں بدستور مصروف ہیں۔

آزادی سے پہلے کا دور

آزادی سے قبل کے دور کے جن شاعروں نے پشتو ادب کے نئے دور کو جنم دیا، اُن میں خادم طٰہٰ اکبر (مرحوم)، صنوبر حسین خاں مہمند (مرحوم)، عبدالاکبر خاں اکبر، بیرسٹر احمد شاہ (مرحوم)،

© rasailojaraid.com